محمد حنیف ندوی

تاثرات

تعلیمی کمیشن

حکومت نے ایک ایسے تعلیمی کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا ہے کہ جو فکر و نظر کے پورے ڈھانچہ کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لے گا کہ اس کو کیونکر اسلامی بنایا جا سکتا ہے؟ اور کس طرح کالجوں اور یونیورسٹیوں کے غیر دینی ماحول کو اسلامی اور دینی ماحول میں بدلا جا سکتا ہے؟ یقیناً یہ مقصد نہایت نیک ہے۔ اور اس لائق ہے کہ اس پر قلبی مسرّت کا اظہار کیا جائے۔ مگر ہمیں کہنے دیجیئے کہ یہ کام اتنا مشکل، محنت طلب اور ژرف نگاہی کا ہے۔ کہ اگر اسے ٹھیک طریق سے انجام نہ دیا گیا، تو خطرہ ہے کہ کہیں مایوس کن ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس سلسلہ میں ہم چند مشورے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی اہم بات ہمارے نزدیک یہ ہے کہ کمیشن کا حلقۂ رکنیت نہایت مختصر ہو۔ اور صرف چند ایسے منتخب لوگوں پر مشتمل ہو جو مجمع البحرین ہوں۔ جو اسلامی علوم اور مغربی علوم کے مزاج سے واقف ہوں۔ جنہیں تعلیمی تجربہ ہو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو فی الواقع اپنے پہلو میں یہ تڑپ رکھتے ہوں کہ ہمارے تعلیمی ادارے اسلامی علوم و روایات کے صحیح معنوں میں حامل ثابت ہوں۔ کمیشن کی موجودہ ہیئت ترکیبی جس کا اخبارات میں اعلان ہؤا ہے افسوس ہے کہ اس معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ اس میں بلا شبہ تعلیمی اداروں اور تعلیمی اشخاص کی زیادہ سے زیادہ نمایندگی کا خیال رکھا گیا ہے۔ لیکن اس میں دو اصولی نقص ہیں جن کی پوری اصلاح ہونی چاہیئے۔ ایک تو اشخاص کے انتخاب میں احتیاط روا نہیں رکھی گئی۔ اور یہ نہیں دیکھا گیا کہ اس عظیم مقصد کے لئے کون کون لوگ زیادہ استحقاق رکھتے ہیں؟ اور کس کس میں خصوصیت سے اس منصوبہ کو پروان چڑھانے کی زیادہ صلاحیت ہے۔ دوسرے اس کا حلقہ رکنیت زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ حالانکہ عملی لحاظ سے اس نوع کے کمشنوں کو گنے چُنے اور نہایت ہی چیدہ حضرات پر مشتمل ہونا چاہیئے۔

یہ صحیح ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد اس مسئلہ نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے کہ ہماری تعلیم ہمارے نظریۂ حیات کے مطابق ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ خیال بالکل ہی اچھوتا نہیں ہے۔ برطانوی عہد

میں بھی اس نوع کی کوششیں برابر جاری رہیں کہ طلبہ میں اسلامیات کا ذوق پیدا ہو اور وہ مغربی علوم کے ساتھ ساتھ دینی معلومات سے بھی بہرہ مند ہوں۔ مگر اس طرح کی کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں۔ اور کالج اور یونیورسٹی سے سندِ فراغت حاصل کرنے والے طلبہ کے دل و دماغ میں اسلامی اقدار و تصوّرات کی برتری و معقولیت کا کوئی تاثر نہ پیدا کرسکیں۔ اس لئے کہ دین و دنیاوی علوم کی مہمل اور گمراہ کُن تفریق کو بدستور قائم رہنے دیا گیا۔ اور ازراہِ سادگی و سادہ لوحی باور کر لیا گیا، کہ دنیاوی علوم میں دین سے کہیں تصادم نہیں ہوتا۔ اور وہ خیالات جو حیاتیات، سائنس، اخلاقیات، نفسیات اور سیاسیات کی مختلف راہوں سے اُبھرتے ہیں، اس کا کوئی تعلق براہِ راست دین سے نہیں ہے۔ لہٰذا اگر طلبہ کو سادہ اسلامی عقائد سے آگاہ کر دیا جائے اور نماز روزے کے مسائل بتا دئے جائیں۔ تو ان میں دین سے وابستگی قائم رہے گی اور الحاد و زندقہ کے جراثیم قلب و ذہن کی صحت پر اثر انداز نہیں ہو پائیں گے۔

یہ خیال یقیناً غلط تھا، اور یہ تفریق بالکل مہلک اور مضر تھی۔ جن لوگوں نے موجودہ علوم و فنون کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی اُٹھان ہی میں لادینی ذہن و فکر کی کارفرمائیاں ہیں۔ اور ان کے خمیر و اصل میں بے دینی و الحاد کی ہولناکیاں ہیں۔ اور ان کی زد میں مذہب کے وہ بنیادی مسلمات اور بڑے بڑے اصول آتے ہیں کہ جن پر دینی تفصیلات و جزئیات کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ بنابریں کمیشن کے محترم اراکین کے لئے دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ آیا وہ بھی برطانوی عہد کے اسی فرسودہ طریق کو آزمانا چاہتے ہیں۔ یا اس تفریق کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ دوسری صورت میں ان کے سامنے ایک اہم سوال یہ آئے گا کہ جدید علوم و فنون کو اسلامی انداز سے کیونکر پڑھایا جائے، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے، کہ علوم و فنون کے موجودہ لادینی مزاج کو کیونکر بدلا جائے، اور ان کو ملحدانہ تاثرات سے کیونکر پاک کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ سردست یہ کام کمشن کے کرنے کا نہیں۔ اس کیلئے تو ایک عرصہ چاہئے۔ اس لئے کہ موجودہ علوم و فنون کا مزاج ایک شب و روز میں ملحدانہ نہیں ہؤا ہے۔ بلکہ یہ صدیوں کے ارتقائی عمل کا قدرتی نتیجہ ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں ان کے مزاج کو بدلنا ہے اور ان سے تبلیغ و اشاعت کا کام لینا ہے، تو انتظار کیجئے۔ جب تک ہمارے ہاں نئے سرے سے غزالی، رومی اور ولی اللہ ایسے اصحابِ بصیرت و اجتہاد پیدا نہیں ہوتے، اور موجودہ حقائق کا رُخ دین کی طرف نہیں موڑتے، اس وقت تک ان علوم و فنون کو اسلامی سانچوں میں ڈھالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس وقت جو ممکن ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر اساتذہ اسلامی روح سے واقف ہوں، اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ ہوں اور یہ جانتے ہوں کہ خاص خاص فنون میں اسلام کا کیا موقف ہے اور کس حد تک

وہ صائب اور حق بجانب ہے۔ تو اپنے ان خیالات کو وہ طلبہ تک پہنچاتے رہیں۔ اور خصوصیّت سے اُن نظریات کی تردید کرتے رہیں جو صراحتاً اسلامی روح کے خلاف ہیں اور کسی طرح بھی جن کو اسلام کے نظامِ عقائد کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی بحیثیت مجموعی اساتذہ کے سامنے یہ نصب العین رہنا چاہیئے کہ انہیں مسلمان طلبہ میں اسلامی ذہن کی تخلیق کرنا ہے۔ اور یقین دلانا ہے کہ ان کا مذہب نہایت معقول و متوازن ہے اور اس میں کوئی بات ایسی نہیں جو جدید مسلمات کے منافی ہو۔

یہ ذمہ داری ہم اساتذہ پر اس لئے ڈال رہے ہیں کہ موجودہ حالات میں اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ ہمارے پاس نہ ایسی کتابیں ہیں اور نہ ایسا لٹریچر ہے جو اس غرض کو پورا کرتا ہو اور نہ ابھی تک اس نقطۂ نگاہ سے ہم نے اپنے نظامِ تعلیم کا جائزہ ہی لیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اسلامی ذہن کی تخلیق کا مسئلہ چونکہ وقت کا ایک اہم اور ضروری مسئلہ ہے لہذا اس کا کوئی نہ کوئی قابلِ عمل حل تلاش کرنا ہی ہوگا۔

ہمارے نزدیک اسلامی ذہن پیدا کرنے کے لئے اساتذہ کی ان کوششوں کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ اسلام کی ثقافتی تاریخ اس انداز سے پڑھائی جائے کہ جس سے طلبہ میں قومی پندار بیدار ہو۔ اور انہیں معلوم ہو سکے کہ موجودہ تہذیب و تمدّن کے ارتقاء میں ہمارے اسلاف کے کارناموں کو کس حد تک دخل ہے۔ تاکہ شروع ہی سے اسلامی تہذیب کی دھاک دلوں پر بٹھائی جا سکے۔ اور یہ تاثر پیدا کیا جا سکے کہ اسلام کسی ساکن و متحجر نظریۂ حیات کو پیش کرنے والا نہیں ہے۔ بلکہ ہر ہر دور میں اس نے انسانیت کو جلا بخشی ہے، اور تہذیب و تمدّن کی زلفِ معقد کو سنوارا اور چمکایا ہے۔

اگر اُردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کر لیا جائے تو اس سے بھی اس مقصد کے حصول میں بالواسطہ مدد ملے گی۔ کیونکہ اُردو صرف زبان ہی نہیں ایک تہذیب اور ثقافت بھی ہے۔

آخری بات جو اس باب میں ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کو ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بار ملنا چاہیئے۔ کیونکہ جس کامیابی کے ساتھ اُنہوں نے شعر و سخن کی ہلکی پھلکی زبان میں اسلامی اقدار کو پیش کیا ہے، اور جس معقولیت اور اونچے معیار سے اُنہوں نے موجود تہذیب افکار کی چھان بین کی ہے۔ اور ان میں جو نقائص ہیں ان کی نشان دہی کی ہے یہ صرف انہی کا حصہ ہے۔ اگر اقبال کا فلسفہ اس کے حکیمانہ تصوّرات اور شاعری کو کسی طرح نصابِ تعلیم کا جزو قرار دیا جا سکے تو ہم وثوق و اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری مشکلات کا بڑی حد تک ازالہ ہو جاتا ہے۔ اور ہم بہت سی کتابوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔